دینی مدارس

اور

عصر حاضر کے تقاضے

مولانا محمد رضوان القاسمی

کنوینر مجلس مذاکرہ (سمینار) دو روزہ دینی تعلیمی و دعوتی کانفرنس

منعقدہ ۱۸، ۱۹ / ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ م ۲۴، ۲۵ / فروری ۱۹۸۱ء

سہ شنبہ - چہار شنبہ

شائع کردہ:

دفتر مجلس استقبالیہ دو روزہ دینی تعلیمی و دعوتی کانفرنس

دار العلوم حیدرآباد پنجہ شاہ، حیدرآباد آندھرا پردیش

دینی مدارس اور عصرِ حاضر کے تقاضے

تالیف

مولانا محمد رضوان القاسمی
کنوینر مجلس مذاکرہ (سمینار) دو روزہ دینی تعلیمی و دعوتی کانفرنس
منعقدہ ۱۸، ۱۹ ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ م ۲۴، ۲۵ فروری ۱۹۸۱ء، سہ شنبہ چہار شنبہ

پیش لفظ

حضرت مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقلؔ مدظلہ

شائع کردہ
دفتر مجلس استقبالیہ دو روزہ دینی تعلیمی و دعوتی کانفرنس
دارالعلوم حیدرآباد، پنجہ شاہ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲ (الہند) فون ۴۴۱۶۱

مطبوعہ: اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد
قیمت رعایتی ایک روپیہ (۱/)

فہرست عنوانات

دینی مدارس اور عصر حاضر کے تقاضے

پیش نقطہ — حضرت مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقل مدظلہ ۳

تعلیم — فکری وعملی زندگی کے لئے خشت اول ۴

اسلام میں تعلیم کی اہمیت ۵

علماء کا منصب اور انکی ذمہ داریاں ۶

علوم نبوت کا آخری ایڈیشن اور اس کی ابدیت ۷

تغیر پذیر دنیا میں دینی مدارس کے فرائض ۸

جدید چیلنج اور عصری تقاضوں سے مراد ۱۱

دینی مدارس کا نظام تعلیم قابل تغیر اور ناقابل تغیر کی خد ۱۲

مدارس اسلامیہ کے نظام تعلیم میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے ۱۴

نصاب تعلیم میں جمود اور بعض مشورے ۱۴

غیر ضروری فنون ۱۹

قابل توجہ فنون ۲۳

جدید فنون سے احتراز — دو عظیم نقصانات کا باعث ۲۶

فن کے بجائے کتاب کی تعلیم؟ ۲۶

انگریزی اور ہندی زبانوں کی تعلیم ۳۲

مختصر مدتی نصاب — وقت کی ایک اہم ضرورت ۳۳

طرز تدریس کی خامیاں ۳۶

نظام تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ۳۹

بنیادی دینی تعلیم کی اہمیت ۴۵

نظم ونسق ۴۷

مدارس میں باہمی ربط ۴۷

دین کے خدمت گذاروں کی خدمت ۴۸

پیش لفظ

حضرت مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقل مدظلہ

بانی دار العلوم حیدر آباد و امیر ملت اسلامیہ آندھرا پردیش

برادران اسلام اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ مسلمانوں میں دینی تعلیم کیجانب عام طور پر توجہ کی کمی کی وجہ ان کی دینی معلومات اور مذہبی شعور دن بدن انحطاط پذیر ہے، شہروں اور اضلاع میں اگرچہ جزوقتی دینی مکاتیب موجود ہیں لیکن انکی حالت کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں، قصبات اور دیہات میں تو دینی تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے نتیجتاً تہذیب و کلچر کے ساتھ ساتھ مقامی مسلمان عقائد و افکار میں غیر اسلامی نظریات کے مقلد وہم خیال بنتے اور اپنی ملی انفرادیت اور تشخص سے دور ہوتے جارہے ہیں، دوسری جانب دینی تعلیمی اداروں میں آپسی ربط و ضبط نہ ہونے کی وجہ سے نہ نصاب کی یکسانیت ہے نہ اساتذہ کی فراہمی اور انکی عصری طریقہ تعلیم کے مطابق تربیت پر توجہ، جسکی وجہ تعلیم کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہورہے ہیں۔ یہی وہ احساسات ہیں جنکے پیش نظر دار العلوم حیدر آباد کے زیر اہتمام دو روزہ دینی و دعوتی کانفرنس منعقد کیجا رہی ہے تاکہ ان سے متعلق جو مسائل ہیں وہ حل کئے جائیں۔

پیش نظر رسالہ بھی مولانا محمد رضوان القاسمی نے اسی پس منظر میں لکھا ہے، یہ رسالہ اپنے مواد اور معلومات کے اعتبار سے نہایت قیمتی ہے۔ امید کہ اہل ذوق اور اصحاب مدارس اسکے مندرجات سے فائدہ اٹھائینگے۔ اللہ تعالیٰ مولف موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے اور یہ سعی ان کی مشکور ٹھہرے۔ ۱۵ ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ مطابق ۲۱ فروری ۱۹۸۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دینی مدارس اور عصر حاضر کے تقاضے

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

تعلیم — فکری و عملی زندگی کے لئے خشت اوّل

تعلیم: دراصل وہ بنیادی اینٹ ہے جس پر ملک و قوم اور سماج کی عملی اور فکری زندگی کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے، اگر یہ پہلی اینٹ سیدھی ہے تو اس پر جو دیوار اٹھے گی وہ بھی سیدھی ہوگی، اور اگر یہ بنیاد ہی ٹیڑھی ہے تو "تاثریا می رود دیوار کج" اس لئے یہ بیک وقت زہر بھی ہے اور تریاق بھی، یہ اسی کا کرشمہ ہے جس نے ایران کے مشرکانہ خمیر سے (جو بے شمار مذاہب اور تمدن کو اپنے اندر ضم کر چکا تھا اور جس کی اباحیت پسندی اور جنس پرستی کی تاریخ پڑھ کر آج بھی شرم و حیا اور انسانیت کانپ اٹھتی ہے) یگانۂ روزگار محدثین بالغ نظر فقہاء و مجتہدین، بلند حوصلہ داعی اور وقت کے برگزیدہ مصلحین پیدا کئے اور یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ سمرقندو بخارا کی وہ مقدس محفلیں جہاں سے قال اللہ اور قال الرسول کی اٹھنے والی آوازیں پورے عالم اسلام میں گونجتی تھیں اور جہاں سے پوری دنیا کو نالۂ نیم شبی اور آہ سحرگاہی کا سبق ملتا تھا آج الحاد و دہریت کے مرکزوں اور خدا بیزاری و مذہب بیگانگی کے گہوارں

میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ فیا للاسف ویا للعجب!

تعلیم کے ان دو طرفہ اثرات پر مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ سابق صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے مختصر لفظوں میں بڑے بلیغ پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے، فرماتے ہیں:

"علم کی تصحیح کا دوسرا نام ایمان ہے۔ عمل، علم سے پیدا ہوتا ہے درخت پانی سے بڑھتا ہے۔ عمل علم سے اگتا ہے۔ غلط علم، غلط عمل کو پیدا کرتا ہے۔ پہلے علم کی تصحیح ہونی چاہیے۔ یہی اصل راہ ہے۔ "اٰمَنُوْا" کے مقام کی تشریح ہولے تو "عَمِلُوا الصّٰلِحٰت" خود انسان کو پیٹ جاتا ہے۔"

(مکاتیب گیلانیؒ مرتبہ مولانا سید منت اللہ رحمانی ص ۹۸، ۹۷)

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

تعلیم کی یہی غیر معمولی اہمیت ہے کہ اسلام نے آکر سب سے پہلے علم و فن کے دیپ جلائے اور کفر و ضلالت کی تاریک وادیوں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کے سامنے اس علم حقیقی کا "آفتاب عالم تاب" روشن کیا۔ جس کا منبع و سرچشمہ علم ربانی تھا اور جس کا آغاز ہی اس علام الغیوب کے نام نامی سے ہوتا تھا۔ "اقراء باسم ربک الذی خلق" اس نے شمشیر و سناں سے پہلے "کتاب و قلم تھامی" رزم جدل سے پہلے بزم علم سجائی، اور زمین و تن سے پہلے دل و نظر کی دنیا کو فتح کیا، اس نے جہالت و گمراہی میں گرفتار دنیا کو للکارا کہ علم و جہل برابر نہیں ہو سکتا۔ "لا یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون" اس نے دنیا کے سب سے پہلے

اور آخری انسان کی "زبان حق ترجمان" سے کہلایا کہ میرا منصب "تعلیم ہے۔
"انما بعثت معلماً" دنیا کے درباروں اور آستانوں سے سیم زر اور
دار و درکی تقسیم ہوتی ہے لیکن اس دین متین کے آخری رسولؐ کے "دربار حق
شعار" سے جو دولت تقسیم کی جاتی ہے وہ یہی علم و عرفان کا جوہر گراں مایہ ہے،
"اِنما انا قاسم واللہ یعطی" یہاں علم کی طلب اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں
اس طرح تڑپنا سکھایا جاتا ہے کہ جو "قاسم العلوم" ہے خود اس کی زبان سے علم میں
اضافہ کی التجا کرائی جا رہی ہے کہ "قُلْ رَّبِّ زِدْنِی عِلْماً" مکہ کی زمین شور جہاں
ایمان جرم تھا اور دین کی دعوت و تعلیم سب سے بڑا گناہ، وہاں بھی علم دینا
کی یہ "دوکان آخرت" سجائی گئی اور مکہ کے ایک شریف النفس اور نجیب الطبع
انسان "ارقم" کے گھر کو درسگاہ نبوی بننے کا شرف حاصل ہوا۔ گویا یہ پہلا اسلامی
مدرسہ تھا جو باطل کی تیز و تند طوفانی ہواؤں کے علی الرغم مکہ میں قائم ہوا۔ تعلیم
کی یہی غیر معمولی اہمیت پیش نظر تھی کہ مکہ کا یہ "کاروان حق" جب مدینہ پہنچا
تو سب سے پہلے مسجد نبوی اور اسی کے ایک طرف صفہ پر "مدرسہ نبوی" کی
تاسیس عمل میں آئی۔

علماء کا منصب اور ان کی ذمہ داریاں

پھر دنیا میں دولتوں اور ثروتوں کی وراثت تقسیم ہوتی ہے، جاہ و اقتدار کا ورثہ ملا کرتا ہے لیکن "معلم انسانیت" صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار مقدس سے بانٹی جانے والی
وراثت یہی علم دین ہے "اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ" یہ حدیث جہاں ایک
طرف علماء کی عظمت شان، ان کے جلیل القدر منصب، اور عنداللہ انکی فضیلت

و برگزیدگی کو بتلاتی ہے وہیں دوسری طرف ان کی غیر معمولی ذمہ داریوں، انکے عظیم الشان فرائض اور ان کی دشوار گذار راہوں کی طرف بھی توجہ دلاتی ہیں، کہ اس علم نے ان کے دوش پر وہ گراں بار ذمہ داریاں رکھدی ہیں، جن کو اپنے اپنے وقت میں اولوالعزم نبیوں اور بلند حوصلہ پیغمبروں نے انجام دیا ہے۔

علوم نبوت کا آخری ایڈیشن اور اس کی ابدیت

کار نبوت دراصل ایک بڑا نازک اور دشوار کام ہے۔ "نبی" کی حیثیت پوری انسانیت اور کائنات کی طرف خدا کے نمائندہ کی ہوتی ہے "اِنا ارسلنٰک بشیرًا و نذیرًا الی الناس کافۃ" یعنے ایک طرف اس کا رشتہ اپنے خالق اور پالن ہار سے ہوتا ہے، دوسری طرف اس کی نگاہ اپنی امت اور بندگان خدا پر ہوتی ہے وہ وقت کے تیور پہچانتا ہے۔ حالات کی نبض تھامتا ہے۔ وہ اپنی بالغ نظری اور دور اندیشی سے زمانہ کے تقاضوں کو سمجھتا ہے وہ اپنی نگاہِ حق شناس اور دلِ حکمت آشنا سے عصری ضرورتوں کو محسوس کرتا ہے اور پھر ان کے سامنے "علم الٰہی" کی وہ قیمتی متاع اس خوش اسلوبی سے رکھتا ہے کہ دنیا اس کا وزن محسوس کرے۔ وہ اس پیغام میں اپنے دردِ دل کا علاج، اور اپنی ضرورتوں کا نسخۂ کیمیا پائے اور اسکے لئے جبین تسلیم خم کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں مختلف انبیاء آتے رہے۔ ان کی شریعت ان کے الہامی قوانین، ان کی کتابوں کا اسلوب اور لب و لہجہ اور دلائل و شواہد اور ان کی تعبیر پر زمانے کی گہری چھاپ

تھی۔ ان میں عصری حالات کی، اور مخاطب کے نفسیات کی پوری پوری رعایت موجود تھی۔ پھر جب جب محسوس کیا گیا کہ اب زمانہ کی قدریں تبدیل ہوگئی ہیں۔ انسانی تمدن ارتقاپذیر ہوچکا ہے۔ فکرو نظر کے زاویے تبدیل ہوگئے تو نئی الہامی کتاب، قوانین اور اسلوب کی تبدیلی کے ساتھ دنیا میں بھیجی گئی لیکن حضرت مسیح کے ۵۷۰ سال بعد جب انسانیت پختہ ہوچکی تھی، تمدن جوان ہوچکا تھا، تہذیب بالغ ہوچکی تھی، اور انسان فکر و نظر کے ایک قابل ذکر زینہ پر پہونچ چکا تھا، تو اب ضرورت تھی کہ "دین متین" کا وہ آخری ایڈیشن انسانیت کے نام بھیجدیا جائے اور علم و فضل کی وہ آخری "شمع دلفراز" بنی آدم کے ہاتھوں میں دیدیجائے جس میں قیامت تک نقطہ برابر بھی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ اسکے لئے پیغمبر آخرالزماں کا انتخاب کیا گیا۔ پس اب یہ دین ابدی ہے۔ یہ الہامی قوانین ابدی ہیں یہ شریعت ابدی ہے اور یہ علم اور اس کی ضرورت اور افادیت بھی ابدی ہے۔

تغیر پذیر دنیا میں دینی مدارس کے فرائض

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وقت تھم گیا ہے۔ حالات کے قدم ٹھٹھر گئے ہیں اور زمانہ نے تغیر سے توبہ کرلیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں" عصری تقاضے جس طرح کل تغیر پذیر تھا آج بھی ہیں اور جس طرح کل علوم الہامی میں ان حالات کی رعایت ضروری تھی، اسی طرح آج بھی اس امانت خداوندی کی تعبیر میں ان تغیر پذیر قدروں کو

ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

ان حالات میں مدارس اسلامیہ کا فریضہ ہے کہ عصری حالات ضروریات اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر آگے بڑھیں اور علم دین کے اس مشعل کی حفاظت کریں۔ "اسلامی ہند" کے زوال کے بعد ہندوستان میں قائم ہونے والی اپنی نوعیت کی منفرد اور غالباً سب سے پہلی درسگاہ "دارالعلوم دیوبند" کے قیام کا منشا بھی یہی تھا۔ دارالعلوم دیوبند محض روایتی طور پر تعلیم و تعلم اور چند فنون عالیہ اور آلیہ کی درس و تدریس ہی کے لئے قائم نہیں ہوا تھا بلکہ اگر اس کے قیام کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا اس نے عصری چیلنج کو قبول کیا تھا۔ بدلے ہوئے حالات میں دین کی تعبیر اور "اظہار" کا فریضہ اپنے اوپر عائد کیا تھا اور وقت کی تیز و تند ہواؤں اور مغربی الحاد و دہریت کے طوفان صرصر میں بے اندازخروانہ اسلام کا چراغ روشن رکھنے کی نازک ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔

ٹھیک اس وقت جب ہندوستان کے مغربی غاصبین نے صوفیاء و محدثین اور فقہاء و اولوالعزم مبلغین کی اس سرزمین پر کہ جن کی انتھک کاوشوں اور دعوتوں سے مذہب اور اخلاقی جذبات یہاں کے ذروں میں پیوست ہوچکے تھے کو عیسائیت اور مغربی لامذہبیت کے سانچہ میں ڈھالنے کی نامسعود مساعی شروع کردی، اور خود لارڈ میکالے کے الفاظ میں ایک ایسی نسل کی نشوونما شروع ہوگئی۔ جن کو عصری درسگاہوں کے گوشت پوست اور نام و نسب کا ہندوستانی رہنے دیا جائے لیکن فکر و نظر میں

انگریز بنا دیا جائے۔ چند خدا ترس نفوس نے جو اپنے سینہ میں دل دردمند اور اپنے دماغ میں "فکر ارجمند" رکھتے تھے۔ اپنی تمام تر ظاہری بے سروسامانی اور مادی تہی دامانی کے باوجود محض اخلاص و للّٰہیت اور صبر و توکل کا سرمایہ لے کر اٹھے اور اس "مدرسۂ عربیہ" کی بنیاد رکھی جو آج "ازہر الہند جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند" ہے۔ کم و بیش دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی عصری حالات ہی کا ردعمل تھا۔

اور اس میں شبہ نہیں کہ ان دینی مدارس نے بڑی حد تک شہادت حق اور اظہار دین کا یہ فریضہ انجام بھی دیا اور جو کچھ دینی اثرات موجود ہیں وہ انہیں کی "کیمیا اثر" نگاہوں اور مسیحائی کا اثر ہے، اور یہی چیز ہے جو آج کے مغرب زدہ اور دین دشمن طبقہ کی نگاہ میں کھٹکتی رہتی ہے۔ کہا گیا ہے "الفضل بما شھدت بہ الاعداء" چنانچہ آنجہانی دلوائی نے اپنی کتاب "ماڈرن اسلام ان انڈیا" میں لکھا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی رجعت پسندی اور مسلم پرسنل لا وغیرہ میں ان کا مذہبی جمود اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک مدارس کا یہ جال پھیلا رہے گا اور ان سے ملاؤں کی جماعت پیدا ہوتی رہے گی"۔

ہمارے بزرگوں کی اس دانشمندانہ روایت، خدا اور رسول کی طرف سے عائد ہونے والی "احقاق حق" اور شہادت حق کی اہم ذمہ داری اور منصب علم کے تقاضوں پیش نظر رکھتے ہوئے مدارس اسلامیہ کا فریضہ ہے کہ وہ زمانہ کی تغیر پذیر قدروں اور بدلتے ہوئے حالات سے

اپنے آپ کو ہم آہنگ کریں۔ نئے زمانہ نے جو نئے مسائل پیدا کئے ہیں ان کو حل کرنے کی صلاحیتیں پیدا ہوں اور ہم جدید چیلنج کا مقابلہ کرنے اور ان کا سامنا کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔

جدید چیلنج اور عصری تقاضوں سے مراد

جدید چیلنج کے مقابلہ" اور عصری تقاضوں کی رعایت سے میری مراد یہ ہے کہ طالبان مدارس درسگاہوں کے مضبوط حصار سے باہر نکلنے کے بعد جن حالات سے دوچار ہوں وہ ان کے لئے نامانوس اور اجنبی نہ ہوں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور نہ ہو جائیں کہ انھوں نے اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصہ ایک ایسے قلعہ میں بند رہ کر گذارا ہے جس کا باہر کی دنیا سے کوئی رشتہ نہ تھا بلکہ وہ اس پوزیشن میں ہوں کہ موجودہ تمدن ـ جس کی رگ و پے میں الحاد و دہریت کا خون دوڑ رہا ہے اور جس میں علوم و معارف کے ذریعہ خالق کائنات سے "جڑنے" کے بجائے "ٹوٹنے" اور "قرار" کے بجائے "فرار" کی تعلیم دی جاتی ہے کو اسلام اور اخلاقی اقدار کے سانچہ میں ڈھال کر مسلمان بنا سکیں، اسلام کے پیش کردہ نظام حیات اور اس کے تمام شعبوں پر ان کو گہری بصیرت حاصل ہو۔ اسلام کے خلاف ہونے والے فکری اور نظریاتی اعتراضات سے بھی وہ نابلد نہ ہوں، اور وہ اس کا مسکت جواب دینے کی پوزیشن میں ہوں نیز اس پیغام کو عام کرنے کے لئے داعیانہ کردار ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں اس کا جذبہ بھی اور اس پر کامل وثوق بھی۔

جدید چیلنج کے مقابلے اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے سے

میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ بعض "تجدد پسندوں" اور نام نہاد روشن خیالوں کی طرح زمانہ پر اسلام کی چھاپ ڈالنے کے بجائے خود اسلام کو تراش خراش کر کسی طرح موجودہ ملحدانہ تہذیب پر فٹ کر دیا جائے اور مغرب سے اٹھنے والی ہر آواز پر سمعنا و اطعنا کہہ کر اسلام پر اسکو مسلط کیا جاتا رہے۔

یہ سمجھنا انتہائی غلط ہوگا کہ چونکہ زمانہ تبدیل ہو گیا ہے۔ حالات بدل گئے ہیں، اور معاشرتی، معاشی قدریں بدل گئی ہیں۔ اس لئے اب کتاب و سنت اور الہامی نصوص سے ثابت ہونے والے چودہ سو سال پہلے کا اسلام نظر ثانی کا محتاج ہے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ، اس کی نئی تعبیر اور جدید تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے اس کی تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اپنی عقل و خرد سے اضافہ و ترمیم کو راہ دیا جائے۔ بلکہ اسلام ایک دین فطرت ہے اس کے قوانین و احکام میں انسانی فطرت کی رعایت کی گئی ہے، اور یہی اس قانون کی اصل روح اور اس تعلیم کے لئے اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے دنیا میں یہ جو کچھ انقلابات کی بوقلمونیاں اور رنگینیاں ہم دیکھ رہے ہیں وہ محض وسائل و اسباب میں رونما ہوتی ہیں۔ انسانی فطرت اور اس کے بنیادی فطری تقاضے، اس کے احساسات اور دواعی و جذبات جو کل تھے وہی آج بھی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

دینی مدارس کا نظام تعلیم۔ قابل تغیر اور ناقابل تغیر کی حد

پس مدارس اسلامیہ کی تعلیم، نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کا بنیادی عنصر اور مقصود ہر دور میں یکساں رہا ہے، اور

رہے گا۔ اگر اسلام ایک ابدی اور آفاقی پیغام ہے اور رہتی دنیا تک کیلئے "مشعل ہدایت ہے، اور یقیناً ہے تو پھر یہ عنصر ناقابل تغیر ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے آخری رسول نے انسان کے لئے جو دستور العمل بھیجا ہے اور جس میں پوری کائنات کی کامیابی مضمر ہے اسکو جانا جا سکے۔

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ مدارس کا پورا نظام اور پورا تعلیمی ڈھانچہ ناقابل تغیر ہے، اور وہ صرف ماضی کی روایات زندہ رکھنے اور بدلتے ہوئے حالات میں قدیم علوم و فنون کا "آثار قدیمہ" بن کر رہنے کے لئے آیا ہے۔ مدارس کی ان تغیر پذیر قدروں کو جاننے کے لئے آپ علماء اسلام اور مجددین و داعیان عصر کی تاریخ دیکھ جائیے۔ امام مالک اور ابن شہاب زہری سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد علی مونگیری تک تمام سلف صالحین کی اصلاحی، علمی، اور دعوتی خدمات کا جائزہ لیجئے۔ اصل روح ہر جگہ ایک ہی ہے اور وہ ہے دین کا تحفظ۔ اور عصری مزاج کی روشنی میں اس کی اشاعت اور احیاء۔ مگر اس کے لئے جو طریق کار اختیار کئے گئے ہیں وہ ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں اور اپنے اپنے عہد کے لئے ضروری بھی۔

اس مرحلہ پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو اپنے تعلیمی نظام پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اور ضروری ہے کہ ہم اس میں مناسب ترمیم گوارا کریں نیز ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ آج ان درسگاہوں سے فضلاء کی جو کثیر تعداد نکلتی ہے اس لحاظ سے یہ صورت حال کچھ

امید افزا نہیں ہے اور اس کی افادیت جو ہونی چاہیئے اس لحاظ سے یہ تناسب مایوس کن ہے۔

مدارس اسلامیہ کے نظام تعلیم میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے؟

ایسا کیوں ہے، اور مدارس اسلامیہ کے نظام تعلیم کو زیادہ مفید، فعال، اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے کن اصلاحات کی ضرورت ہے؟ میرے خیال میں اس سلسلہ میں درج ذیل امور قابلِ غور ہیں :۔

(۱) نصابِ تعلیم میں ایک گونہ جمود۔

(۲) بعض ایسے فنون پر، جو براہ راست دین سے تعلق نہیں رکھتے تھے محض وقتی مصالح کی بناء پر ان کی تعلیم دی گئی تھی، ضرورت سے زیادہ اصرار اور ان کی جگہ جدید علوم و فنون سے بے توجہی بلکہ بے نیازی۔

(۳) فن کے بجائے کتاب کی تعلیم۔

(۴) طرزِ تدریس کی خامیاں۔

(۵) دوسری اہم اور علاقائی زبانوں کے سیکھنے سے احتراز۔

(۶) مدارس میں باہمی ارتباط، اور نظم و ضبط کا فقدان۔

اب ذیل میں ہم نکات کی کچھ تشریح کرتے ہیں اس کے بعد آخر میں کچھ دوسری باتیں عرض کرینگے۔

نصاب تعلیم میں جمود اور بعض مشورے

نصاب تعلیم میں جمود کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آج جو کچھ کتابیں مدارس اسلامیہ میں

پڑھائی جارہی ہیں وہ یکسر دریا برد کردیے جانے کے قابل ہیں، وہ علمی بصیرت اور دینی فہم پیدا کرنے سے قاصر ہیں اور ان کو پڑھانے کی کوئی افادیت نہیں ہے۔ یہ بات جو کہی جاتی ہے بڑی جسارت ہے۔

لیکن بایں ہمہ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ "نصاب تعلیم" کا جو مقصود ہوتا ہے اس لحاظ سے مدارس کی مروجہ کتابوں میں سے اکثر نظرثانی کی محتاج ہیں، اور زمانہ کا تقاضا ہے کہ اب ان کو "کتب درس" کے بجائے "کتبِ مطالعہ" کی فہرست میں جگہ دی جائے۔ ایسا کیوں ہے؟ اور اسکا تبادل کیا ہے؟ اس پر تو ہم آگے گفتگو کریں گے۔ ابھی تو ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ فنون کیا ہیں؟ جن کو آج داخل نصاب ہونا چاہیے، مگر وہ اس سے محروم ہیں۔ اور دینی علوم کے وہ کونسے شعبے ہیں جو زیادہ محتاج توجہ تھے۔ مگر وہ مدارس اسلامیہ کی بے توجہی کیلئے شکوہ سنج ہیں۔

مغرب سے الحاد کا جو سیلاب آیا تھا اور اسلام کے پیش کردہ نظامِ حیات پر جو اعتراضات ہو رہے تھے ان کا صحیح حل یہ تھا کہ "اسرارِ شریعت" کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے نصاب میں داخل کرلیا جاتا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) کی حجۃ اللہ البالغہ۔ حافظ ابن القیم (متوفی   ) کی۔ اعلام الموقعین کے کچھ منتخب حصے یا امام غزالی کی شہرۂ آفاق اور اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف "احیاء علوم الدین" کے وہ ابواب جو سیاست مدینہ اور معاشرت سے متعلق ہیں، کو داخل نصاب کیا جاسکتا تھا یا اسی قسم کی کوئی اور کتاب پڑھائی

جا سکتی تھی مگر چونکہ ملا نظام الدین سہالوی (   ) کے قدیم نصاب میں اس موضوع کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی، مدارس اسلامیہ میں ان کی پذیرائی نہیں ہو سکی۔ ماضی قریب میں بعض مدارس نے اس کو داخل نصاب کیا ہے مگر پھر بھی ان کو وہ اہمیت نہیں دی گئی ہے جو ان کا حق ہے۔

موجودہ دور میں کچھ تو نئی ایجادات اور اس سے زیادہ بین الاقوامی سطح پر قائم غیر اسلامی سیاسی اور معاشی نظام کی وجہ سے نت نئے قانونی مسائل پیدا ہو رہے ہیں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا قانونی حل تلاش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ فقہی ماخذ، اصول، قواعد فقہ، اور طرق استدلال پر گہری بصیرت حاصل ہو، اور اس کے لئے اصول فقہ اور قواعد فقہ، ان دو فنون پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ اصول فقہ میں ہمارے یہاں صرف دو تین کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور ان میں بھی بعض کتابیں کتاب اللہ کی بحث سے آگے نہیں بڑھ پاتی ہیں۔ سنت، اجماع اور قیاس کی بحث تک پہونچنے کی نوبت ہی نہیں آتی ہے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب سے زیادہ توجہ "قیاس" کے مباحث پر کی جائے۔

اور "قواعد فقہ" کے موضوع پر تو عام مدارس میں سرے سے کوئی کتاب ہی نہیں پڑھائی جاتی ہے۔ حالانکہ اس موضوع پر علامہ ابن نجیم مصری (متوفی ۹۷۰ھ) کی "الاشباہ والنظائر" بڑی بصیرت افروز کتاب ہے۔ ابوزید دبوسی کی "تاسیس النظر" بھی احناف کے فقہی کلیات و قواعد کے موضوع پر

بڑی عمدہ چیز ہے اور داخل نصاب کئے جانے کی مستحق ہے۔ نئی کتابوں میں حکومت عثمانیہ ترکی کے وزیر عدل علی حیدر کی گراں مایہ تصنیف درر الحکام "مجلۃ الاحکام" کا مقدمہ بھی داخل نصاب کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح "اصول فقہ" پر بھی زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ نیز اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہی مکاتب فکر اور علی الخصوص مالکیہ کے اصول فقہ کی بھی کوئی کتاب داخل نصاب ہو۔

پھر ہمارے نصاب تعلیم میں "اصول حدیث" اور "اصول تفسیر" سے تو مجرمانہ غفلت برتی گئی ہے، یا تو اس موضوع پر سرے سے کوئی کتاب ہی نہیں پڑھائی جاتی ہے، یا کوئی مختصر سا رسالہ پڑھا دیا جاتا ہے، اور وہ بھی اس رواروی میں، گویا صرف "برکت" حاصل کرنا مقصود ہے۔ حالانکہ اصول حدیث میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی مایۂ ناز تصنیف "فتح الملہم" کا مقدمہ سبقاً سبقاً پڑھایا جائے تو بڑا مفید ہو۔ اصول تفسیر پر متقدمین کی بہت سی عمدہ جامع، مفصل اور مختصر ہر طرح کی کتابیں ہیں۔ خود جلال الدین السیوطی کی "الاتقان فی علوم القرآن" کے منتخب ابواب کو پڑھا دینا بہت سود مند ہو گا۔

اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ہم نے خود قرآن مجید سے بھی بڑی غفلت برتی ہے۔ ہمارے یہاں عام طور پر تفسیر کی صرف دو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ "تفسیر بیضاوی" اور "جلالین"۔ بیضاوی سے ظاہر ہے کہ قرآن کی اصل روح سامنے نہیں آتی بلکہ قاری صرف لفظی گورکھ دھندوں اور موشگافیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور وہ بھی صرف سورۂ بقرہ کی حد تک

ہوتی ہے اور جلالین" تو گویا قرآن کا محض عربی ترجمہ ہے۔ بس یہی کُل کائنات ہے۔ ہمارے یہاں تعلیم قرآن کی۔ حالانکہ اس کی شدید ضرورت ہے کہ ابتداءً مفردات قرآن اور ان کی لغوی تشریح و ترکیب پر کوئی کتاب پڑھائی جائے نمونہ کے طور پر مولانا عبد الصمد رحمانی کی "تیسیر القرآن" پیش کیجا سکتی ہے پھر متوسط جماعتوں میں ترجمہ مختصر تشریح کے ساتھ تین سالوں میں پورے قرآن کا پڑھا دیا جائے اور اس کے بعد تفسیر کی مختلف کتابوں، اور مختلف رنگ میں لکھی گئی۔ تصانیف کو ملا کر پورے قرآن مجید کی تفسیر پڑھا دیجائے۔

تاریخ و سیر کو ہمارے یہاں سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دیجاتی ہے حالانکہ یہ مسلمانوں کا، اور علماء اسلام کا خاص فن تھا اور یہ ایسا فن ہے جس کے کسی بھی زمانہ میں غیر اہم ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آج اسلام کے خلاف مغربی دنیا نے جو خانہ زاد پروپگنڈہ کر رکھا ہے، اس کی بڑی وجہ علماء اسلام کی تاریخ سے ناواقفیت اور بے اعتنائی ہے۔ سرکاری درسگاہوں میں یہ موضوع مستقل اور لازمی حیثیت سے داخل ہے۔ جہاں بطور خاص تاریخ اسلامی کو بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مگر ہمارے فضلاء کو ان کی ہوا تک نہیں لگتی۔ ادھر کی چند صدیوں کی بین الاقوامی اہم شخصیتوں کو تو چھوڑیے، غیر مسلم تاریخ کو پس پشت ڈالیے۔ خود اسلام کے قرون اولیٰ کی تاریخ پر ان کا انتہائی سطحی اور سرسری مطالعہ ہوتا ہے یہ ایک المناک حادثہ ہے اس لئے تاریخ اسلام

تاریخ ہند اور تاریخ عالم کے موضوع پر بعض کتابیں ضرور داخل نصاب ہونی چاہئیں۔

یہ زمانہ معروضی مطالعہ کا اور براہ راست چیزوں کو ان کے ماخذ اور اصل مصادر سے سمجھنے کا ہے۔ ہمارے دشمنوں نے اسلامیات کی تعلیم، اس پر گہری بصیرت اور واقفیت کے لئے بڑی بڑی درس گاہیں قائم کی ہیں۔ ہماری تاریخ، عقائد، الٰہیات، علم کلام، اور فقہ و قانون پر ان کی اتنی وسیع نگاہ ہے کہ بسا اوقات حیرت ہوتی ہے وہ اس تعلیم کو اپنے ناپاک عزائم کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اسلام پر خطرناک نشتر چلاتے ہیں۔

ضروری ہے کہ ہمارے مدارس میں کچھ ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جن میں تمام مذاہب کا تعارف، ان کے بنیادی عقائد، ان کے معاشرتی اور معاشی اصول، اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی سیرت، ان کے اصل اور مستند ماخذ کے حوالے سے جمع کی گئی ہوں، جدید دنیا کے جو اہم معاشرتی اور معاشی نظام ہیں، اور جو مشہور تخلیقی اور کائناتی نظریات ہیں، جیسے کارل مارکس، لینن، فرائڈ، ڈارون وغیرہ کے افکار، ان سے طلباء کو واقف کرا دیا جائے۔ فقہ اسلامی کے خاص خاص موضوع پر "بین الاقوامی قوانین" اور "انٹرنیشنل لا" کا ایک سرسری مطالعہ بھی ان کی نظر سے گذر جائے۔ جب تک اس طرح تقابلی مطالعہ کا مدارس میں رواج نہ ہوگا، اور تعلیم میں اس کو بنیادی اہمیت نہیں دی جائے گی۔ جدید چیلنج کا مقابلہ ناممکن ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ نصاب کے سلسلے میں اصلاً ان مدارس کا اقدام ہی موثر ہوگا جن کی حیثیت "امّ المدارس" کی ہے۔

غیر ضروری فنون | ہمارے یہاں علوم آلیہ کی حیثیت سے جو فنون پڑھائے

جاتے ہیں وہ یہ ہیں: "نحو، صرف، ہیئت، ادب، قدیم منطق، قدیم فلسفہ اور معانی" — ان کتابوں میں بھی معانی اور ادب پر جتنا زور دیا جانا چاہیئے نہیں دیا جاتا ہے، اور ادب میں بھی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر مقفی، مسجع عبارتوں یا پھر نظم پر مشتمل ہے۔ عربی کے جدید اسلوب پر کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی، اور اس پر توجہ نہیں دیجاتی کہ طلبہ عربی بولنے لکھنے کا ملکہ حاصل کر سکیں، اور سب سے زیادہ ستم طلبہ پر منطق اور فلسفہ کا بار گراں رکھ کر کیا جاتا ہے۔ ان فنون میں عام طور پر درس نظامی میں کبری، مرقاۃ، شرح تہذیب، قطبی، سلم، ملاحسن، ہدایۃ الحکمۃ، ہدیہ سعیدیہ، میبذی پڑھائی جاتی ہے۔ حالانکہ فنی اصطلاحات جاننے کے لئے صرف مرقاۃ اور ہدایۃ الحکمۃ کافی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴-۱۱۷۶) نے غالباً پہلی بار ہندوستان کے علماء کو اس دام فریب سے نکلنے کی دعوت دی (تفہیمات الٰہیہ) مگر ہندوستانی درسگاہوں میں یہ دعوت صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ) نے اپنے زمانۂ سرپرستی میں ان فنون کو نصاب سے خارج کر دیا تھا (علماء ہند کا شاندار ماضی صفحہ ج ۵) بلکہ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تو یہاں تک نقل کیا ہے کہ مولانا گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ اس فن سے لگاؤ رکھتے ہیں ان کو مجھ سے فسخ بیعت کر لینا چاہیئے۔

علماء متقدمین کی رائے بھی اس بارے میں کچھ اچھی نہیں تھی۔ علامہ مجد الدین فیروز آبادی (متوفی ۸۱۷ھ) نے لکھا ہے کہ بعض علماء منطق میں مشغول ہونے کو حرام سمجھتے تھے (بصائر ذوی التمییز صفحہ ج ۱)۔ منطق اس

عہد میں کتنا مذموم فن سمجھا جاتا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ "طاش کبریٰ زادہ (متوفی ۹۶۲ھ) نے مفسر ابوالحیان (متوفی ۷۴۵ھ) سے نقل کیا ہے کہ:

ان اهل المنطق بجزیرة الاندلس كانوا یعبرون عن المنطق بالمفعل تحرزاً عن صولة الفقهاء حتى ان بعض الوزراء اراد ان یشتری لابنه كتاباً من المنطق فاشتراه خفیةً خوفاً منهم (مفتاح السعادة ص۲۵ ج۱)

اہل منطق جزیرۂ اندلس میں فقہاء کے خوف سے اشارہ سے منطق کے مسائل بیان کیا کرتے تھے یہاں تک کہ بعض وزراء نے اپنے لڑکوں کے لئے کتاب خریدنی چاہی تو مارے خوف کے چھپا کر خریدا۔

حافظ ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) نے منطق کو علوم اسلامیہ میں داخل کرنے کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

ما اظن الله ان یغفل عن المامون العباسی ولا بد ان یعاقبه بما ادخلها على هذه الامة دارى المنطق (کشف الظنون ص۳۵ ج۲)

میرا گمان ہے اللہ تعالےٰ مامون عباسی سے چشم پوشی نہ کرے گا اور ضرور اس کو سزا دے گا۔ اس لئے کہ اس نے امت محمدیہ پر منطق فنون داخل کئے۔

علامہ ابو اسحاق شاطبی مالکی (متوفی ۷۹۰ھ) نے منطق اور فلسفیانہ اصطلاحات اور فنی بحثوں کو علمائے اسلام کے لئے غیر مناسب، شرعاً غیر معتبر اور عبث قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

واما الثانی منهم مالا یلیق بالجمهور لعدم مناسبته للجمهور

اور دوسرا علم جو جمہور کے لئے مناسب نہیں ہے اور جمہور کیلئے اسکے نامناسب

اخرجه عن اعتبار الشرع
له ...... كما اذا طلب معنى الملك
فاجيب به على معنى اغمض منه
وهو ماهية مجردة او العادة
اصلاً، او يقال جوهر بسيط
ذو نهاية ونطق وعقل
او طلب معنى الانسان فقيل
هو الحيوان الناطق المائت
...... او سئل عن المكان
فيقال هو السطح الباطن من
الجرم الحاوی المماس بالسطح
الظاهر من الجسم المحوی
...... معلوم ان الشارع
لم يقصد الى هذا ولا
كلف به۔
(الموافقات، ص۵۷ ج ۱)

ہونے نے اس کو شرعاً غیر معتبر بنا دیا
ہے ...... یہ ہے کہ جیسے فرشتہ کا معنے
پوچھا جائے اور اس سے بھی غامض
اور مبہم الفاظ میں اس کا جواب یوں
دیا جائے کہ "فرشتہ ایسے جوہر بسیط کا نام
ہے جو فانی ہو، اور نطق (بولنے کی
صراحت) اور عقل کا مالک ہے" یا یہ کہ
انسان کا معنی پوچھا جائے تو کہا جائے
"وہ بولنے والا اور مرجانے والا جانور ہے"
...... یا مکان کی حقیقت دریافت
کی جائے تو کہا جائے کہ وہ جسم حاوی کی
سطح باطن کے جسم محوی کے سطح ظاہر سے
مس کرنے والے حصہ کا نام ہے ...... یہ
ایک معلوم حقیقت ہے کہ شارع نے ایسے
پر تکلف معنے کا ارادہ نہیں کیا ہے اور نہ
انسان کو اس کا مکلف بنایا ہے۔

بلکہ منطق و فلسفہ سے ترکیب پانے والے علم کلام کے بارے میں بھی
بزرگوں کا خیال تھا کہ:

انها تؤدی الی اثارة الفتن

وہ بدعات اور فتنوں کو ابھارنے

والبدع وتشویش العقائد و یکون الناظر فیہ قلیل الفہم اوطالب للغلبۃ لا الحق ط (فتاویٰ تاتارخانیہ بحوالہ مفتاح السعادۃ)

اور عقائد کو متزلزل کرنے کا باعث بنتا ہے اور کہ اس فن سے دلچسپی لینے والا کوتاہ فہم اور جیت کا طالب بن جاتا ہے حق کا طالب نہیں بنتا۔

شاہ ولی اللہؒ نے "انفاس العارفین" میں اپنے زمانہ کا نصاب تعلیم ذکر کرتے ہوئے منطق اور فلسفہ میں صرف دو تین کتابیں لکھی ہیں "از منطق شرح شمسیہ (قطبی) وطرح از شرح مطالع و از حکمت شرح ہدایۃ الحکمہ"۔ یہ ہے وہ ولی اللّٰہی نصاب جس سے ہندوستان کی اکثر اسلامی درس گاہیں اپنا رشتہ جوڑتی ہیں۔

قابل توجہ فنون

طلبہ کی ذہنی قوت کا بڑا حصہ انہیں آثار قدیمہ کی نذر ہوجاتا ہے۔ اس کی جگہ دیگر اہم فنون ریاضی جدید فلسفہ جنرل سائنس اور جغرافیہ وغیرہ کو دی جانی چاہیئے۔ اولاً تو یہ فنون بجائے خود مطلوب ہیں۔ اور بعض حالات میں ان کی تحصیل فرض ہوجاتی ہے (احیاء العلوم ج ۱) حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا:

العلوم خمسۃ الفقہ للادیان والطب للابدان والهندسۃ للبنیان والنحو للسان والنجوم للزمان۔

علوم پانچ ہیں، علم فقہ دین کے لئے علم طب (میڈیکل) جسم کے لئے ہندسہ (انجینیرنگ) تعمیر کے لئے۔ نحو زبان دانی کے لئے (۱) علم نجوم وقت کے لئے۔

اور امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) کا قول ہے: العلم علمان۔

علم الطب للابدان و علم الفقہ للادیان (مفتاح السعادۃ صفحہ ۳۶۶ ج ۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلف صالحین جدید علوم و فنون کے معاملہ میں کتنے وسیع النظر واقع ہوئے تھے اور اس کی تحسین کرتے تھے۔ امام غزالیؒ (متوفی ۱۲۳۱ھ) نے اپنے دور کے ان علماء پر تنقید کرتے ہوئے جو صرف "فقہ" پڑھنے پر اکتفا کرتے تھے اور دیگر علوم فنون یا طبی وطبی وغیرہ سے بے اعتنائی برتتے تھے لکھا ہے:

کم من بلدۃ لیس فیھا طبیب	بہت سے شہر ایسے ہیں جن میں ذمیوں
الا من اھل الذمۃ ولا یجوز	کے علاوہ کوئی مسلمان طبیب نہیں ہے
قبول شھادتھم فیما یتعلق	حالانکہ ذی اطباء کی شہادت فقہی احکام
بالاطباء من احکام الفقہ ثم	میں قبول نہیں کی جا سکتی، مگر ہم کسی کو طب
لا نری احدا یشغل بہ و	میں مشغول ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے ہیں۔
یتھاترون علی الفقہ ولا	اور فقہ پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ بالخصوص
سیما الخلافیات والجدلیات	اختلافی مسائل پر ...... محض اسلئے کہ
...... ھل ھذا سبب الا ان	طب کے ذریعہ اوقاف اور وصایا کا
الطب لیس یتیسر بہ الوصول	متولی بننا اور یتیموں کے مال کا امین
الی تولی الاوقاف والوصایا و	بننا اور قاضی بننا آسان نہیں ہے۔

حیازۃ اموال الیتامی وتقلد القضاء (احیاء علوم الدین صفحہ ۲۲ ج ۱)

جدید چیلنج کے مقابلہ کے لئے یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ تاریخی اور قانونی حیثیت سے اسلام کو جو چیلنج درپیش ہے اس کے مقابلے کے لئے

سلف صالحین نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہی کافی ہیں۔ بشرطیکہ ان کو وسعت نظر کے ساتھ نصاب تعلیم میں جگہ دی جائے لیکن "علم کلام" یعنے اسلام کے فلسفۂ الٰہیات کو "آج کی چیز" بنانے کے لئے جدید فلسفہ کی تعلیم ضروری ہے اولاً تو یہ جدید فنون تو بے کار نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن اگر کسی غیر مفید یا غیر مطلوب علم کا حاصل کرنا کسی فتنہ کے لئے ناگزیر ہو جائے تو اسے بھی حاصل کیا جائیگا۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

وبعضھا (ای العلوم) خوض فیما لا یتعلق بالدین ولم یکن شیئ منہ مالوفاً فی العصر الاول وکان الخوض فیہ بالکلیۃ من البدع ولکن تغیر الاٰن حکمہ اذ حدثت البدعۃ الصارفۃ عن مقتضی القراٰن والسنۃ..... فیھا ذٰلک لمحذور بحکم مان و نافیہ ما (احیاء علوم الدین ص۲۳ ج ۱)

اور بعض علوم میں اہل فن ان امور میں منہمک ہوتے ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں، حالانکہ قرن اول میں یہ چیزیں مروج نہ تھیں، ایسے امور میں انہاک کلیتہً بدعت ہے لیکن اب اس کا حکم بدل گیا۔ اس لئے کہ اب قرآن وحدیث سے پھیرنے والی بدعت (یعنے جدید فنون) پیدا ہو گئی۔ پس وہ ممنوع ضرورتاً جائز ہو گیا (تاکہ ان فنون پر بصیرت حاصل کرکے معترضین کا ناقدانہ جائزہ لیا جا سکے)

اس لئے مدارس میں ان جدید فنون کی اس حد تک تعلیم دیدینا ضروری ہے کہ وہ اس چہار دیواری سے باہر نکلنے کے بعد اپنے ذوق و مزاج کے مطابق

عصری درس گاہوں میں ان فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں، البتہ ان فنون کی تعلیم متوسطات تک ہی دی جائے تاکہ منتہیٰ درجات میں کتابوں کا غیر معمولی بوجھ نہ ہو جائے۔

جدید فنون سے احتراز دو عظیم نقصانات کا باعث

علماء جدید فنون سے احتراز برتنے کی وجہ سے دو ناقابل تلافی نقصان پہنچے۔ ایک یہ کہ امت جدید و قدیم دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی، اور پھر اس جدید و قدیم نے دو "دینی اور لادینی" جماعتوں کی شکل اختیار کر لی، اور اس تقسیم کا عام ذہن پر یہ اثر پڑا کہ "اسلام" جدید تحقیقات اور علم و عقل کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ دوسرے یہ کہ جس طرح متقدمین نے عصری تحقیقات اور اس زمانہ کے جدید فلسفہ کی روشنی میں اسلام کے مابعد الطبیعی اعتقادات کو ثابت کیا تھا۔ ہمارے دور کے علماء، عصر حاضر کے سائنسی انکشافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسا "جدید کلام" مرتب نہ کر سکے۔ حالانکہ اس موضوع پر لکھی گئی ایک آدھ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جدید تحقیقات سے اسلام کے نقطہ نظر کو غیر معمولی تقویت پہونچتی ہے۔

"فن" کے بجائے "کتاب" کی تعلیم

تیسری بنیادی کمزوری ہمارے مدارس کی یہ ہے کہ نصاب میں ایسی کتابیں داخل ہیں جن میں فنون سے زیادہ لفظی بحثوں، ترکیبوں، دور از کار اشکالات اور ان کے جوابات وغیرہ پر توجہ دی گئی ہے۔ ہلکی پھلکی بات بتانے کے لئے بھی مشکل پیرایہ استعمال کیا گیا ہے اور جن مسائل کو ٹھیٹ الفاظ میں ادا کیا جا سکتا تھا۔

ان کے لئے بھی ایسی اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے کہ عبارت اور بھی ژولیدہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ متقدمین کا بھی یہ اسلوب تحریر نہیں تھا اور ماضی قریب کے مصنّفین بھی اس اسلوب کو پسند نہیں کرتے۔ بیچ کے ادوار میں جب عالم اسلام پر منطق اور فلسفہ کا غلبہ تھا۔ ہر فن کو اسی معقولی رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی اور اسی طرز تعبیر کو زیادہ مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ مثال کے طور پر علامہ سعدالدین تفتازانی کی کم از کم دو کتابیں "شرح عقائد نسفی" "مختصر المعانی"۔ تقریباً ہند و پاک کے تمام قابل ذکر مدارس میں داخل نصاب ہے اور اول الذکر کتاب "علم کلام و عقائد" میں ہے اور ثانی الذکر "بلاغت و معانی" میں۔ ان دونوں کتابوں پر طلبہ کو جتنی ذہنی قوت خرچ کرنی پڑتی ہے شائد کسی دوسری کتاب پر کم از کم اس سے زیادہ محنت درکار نہیں ہوتی لیکن اتنی محنت کے باوجود ان فنون پر ان کو کوئی بصیرت نہیں ہوتی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ مختصر المعانی کے ایک ایسے طالب علم سے جس نے اپنے استاذ کی تقریر زبانی یاد کر رکھی ہے مصنف کے "نظریات" کو اپنے حافظہ میں مستحضر کر لیا ہے اور اپنی طباعی سے عبارتیں حل کرنے میں ایک سے ایک نکتہ پیدا کرتا ہے۔ کسی آیت قرآنی کے بارے میں پوچھ دیا جائے کہ اس میں کیا کچھ بلاغتیں ہیں؟ اور اگر ان الفاظ کے بجائے یہ الفاظ ہوتے تو کیا حرج ہوتا؟ تو عموماً یہ سوال اس کے لئے عقدۂ لاینحل ثابت ہوگا!

ہم اس سلسلہ میں خود کچھ لکھنے کے بجائے مولانا محمد یوسف بنوریؒ جو قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہونے کے علاوہ بڑی دوررس، زمانہ شناس اور مصلحت آشنا

نگاہ رکھتے تھے، کے چند اقتباسات نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

"مدارس دینیہ عربیہ میں اس وقت جو نصابِ تعلیم رائج ہے، حدیث و فقہ کی چند کتابوں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد زیادہ تر ساتویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے قرون کی یادگار ہے۔ جہاں سے صحیح معنوں میں علمی انحطاط کا دور شروع ہو چکا تھا۔ قدماء امت کی وہ تالیفات جن میں علم کی روح موجود تھی عبارت سلیس و شگفتہ، مسائل و قواعد واضح، جن میں نہ عبارتی تعقیدات تھیں نہ دوراز کار ایجاث جن کے پڑھنے سے صحیح معنے میں دل و دماغ متاثر ہو سکتے تھے، نہ وقت ضائع ہوتا تھا، نہ دماغ پر بوجھ کا خطرہ ہوتا تھا۔ ان کی جگہ ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں جس میں سب سے زیادہ کمال اختصار نویسی کو سمجھا گیا۔ زیادہ زور لفظی بحثوں پر دیا گیا۔ لفظی موشگافیاں شروع ہوئیں۔ یوں اگر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کاغذ تو کم خرچ کیا گیا لیکن وقت و دماغ کو اس کے حل پر زیادہ صرف کیا گیا بڑا کمال یہی سمجھا گیا کہ عبارت ایسی دقیق و غامض ہو جس کے لئے شرح و حاشیہ کی ضرورت ہو۔ کئی کئی توجیہات کے بغیر حل نہ ہو۔ آخر یہ علمی عیاشی نہیں تو اور کیا ہے۔ میرے ناقص خیال میں یہ علم کا سب سے بڑا فتنہ تھا جس سے علوم اور اسلامی معارف کو بڑا نقصان پہونچا۔ بطور مثال اسلامی علوم میں اصولِ فقہ لیجئے جو علوم دین اور علوم اجتہاد میں ایک لطیف ترین اور اہم ترین فن ہے جو قرآن و سنت سے نئے نئے استنباطات کے لئے سب سے اہم راستہ تھا جسکی باقاعدہ تدوین کا فخر دولتِ عباسیہ کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابو یوسفؒ کو حاصل ہے اور امت میں اس کے بعد سب سے پہلی کتاب

امام محمد ابن ادریس الشافی کی کتاب "الرسالہ" ہے جو عرصہ ہوا کہ مصر میں "کتاب الام" کے نام کے ساتھ چھپ چکی تھی اور اب کچھ عرصہ ہوا بہت آب و تاب سے دوبارہ قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔ اسی فن میں امام ابوبکر رازی جصاص (متوفی ۳۷۰ھ) نے کتاب "الفصول فی الاصول" لکھی جس کا ایک عمدہ نسخہ دار الکتابت المصریہ قاہرہ میں موجود ہے اور جس کی نقل راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی ڈابھیل حال کراچی کے لئے ہندوستان دپاکستان آئی۔ امام فخر الدین بزدوی نے "کتاب الاصول" لکھی، جس کی عمدہ ترین شرح عبدالعزیز بخاری نے کی ہے، جو ترکی کے سابق دار الخلافہ سے دو دفعہ شائع ہوئی اور بحر العقول عظیم ترین شرح امیر کاتب عمید الدین اتقانی کی "الشامل" دس جلدوں میں دار الکتابت المصریہ قاہرہ میں موجود ہے اور اس کا ایک نسخہ استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ آفندی میں ہے لیکن افسوس کہ دونوں جگہ ابتدائی دو ڈھائی جز کا نقص ہے اس کی نقل بھی راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی میں آچکی ہے۔ امام شمس الائمہ سرخسی نے "کتاب الاصول" لکھی جس کے نسخے ترکی و مصر میں موجود ہیں۔ یہ اور اس کے علاوہ اس فن میں متقدمین کی عمدہ و نافع کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس فن میں امام ابو زید دبوسی کی کتاب "تقویم الادلہ" بے نظیر ہے۔

اب خیال فرمائیے کہ ایسی نادرۂ روزگار کتابوں کی جگہ امام ابن ہمام کی "تحریر الاصول" اور ابن حاجب کی "مختصر الاصول" اور بیضاوی کی "منہاج الاصول" یا ابوالبرکات نسفی کی "منار الاصول" یا صدر الشریعہ کی "التنقیح" ابن امیر بخاری کی نہ ہو اور قاضی بیضاوی کی "منہاج" کی شرح الاسنوی کی نہ ہو تو یہ چیستاں نہیں

امت کے کیا کام آسکتی ہیں؟ یہ مانا کہ ان میں کچھ دقیق و لطیف انکے مختارات یا خصوصی ابحاث بھی ہیں لیکن دوسری طرف مہاتی جس تعبیر میں ادا ہوئی ہیں وہ کوئی علمی روح پیدا کرنے کے لئے مفید نہیں ہوسکتیں"۔

(ماہنامہ الفرقان بابت ماہ فروری و مارچ ۱۹۷۶ء)

دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

"ہر زمانہ کا ایک خاص مزاج اور خاص ذوق ہوتا ہے، جب علم کی صحیح ترقی ختم ہوگئی، یا رک گئی یا یوں کہیئے کہ معراج کمال تک، مبادی علوم کا معیار جب بلند ہوا تو طبعی طور پر علوم اسلامیہ کا انحطاط لازمی تھا۔ اب سارا زور و کمال، تالیف کا معیار قواعد کی تلخیص، مسائل کی تنقیح، عبارت آرائی، متن نویسی و ایجاز طرازی، اختصار کے نئے نئے اسلوب، لفظی موشگافی وغیرہ قرار پایا۔ علمی مسابقت کا میدان بھی بن گیا۔ منظوم قواعد تیار ہونے لگے۔ مبادی و وسائل مقاصد بن گئے علوم عربیت کا مقصد قرآن و حدیث کے لغوی ترکیبی اور اعرابی مشکلات کا حل تھا لیکن آگے چل کر یہ مبادی خود مقاصد بن گئے۔ قرآن و حدیث کی تراکیب اپنی جگہ رہیں۔ خود ان کتابوں کے مسائل و عبارات مرکز توجہ بن گئے۔ ابن حاجب کی کافیہ کو لیجئے جس کی پچاس سے زیادہ شرحیں لکھی گئیں۔ پھر شرح ملا جامی جو ان شرحوں میں سے ایک شرح ہے۔ اس کے حواشی اور شروح کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اس پر اس کی شرح عبد الغفور کو لیجئے۔ پھر اس کا تکملہ عبد الحکیم سیالکوٹی اور ان دونوں کی شرح "دافع التوہمات" کو دیکھئے۔ اسی طرح ابن مالک کی "الفیہ" اس کی شرح، اور ان میں سے شرح "اشمونی" اور پھر اس کی

شرح "صبیان" سات ضخیم مجلدات میں دیکھیئے کہ ساری عمران ہی کے
مطالعہ کی نذر ہو جائے۔ آخر غور کیا جائے کیا یہ مبادی واقعی اتنی توجہ کے
مستحق تھے۔ بہر حال جو کچھ ہوا ایک خاص دور کا تقاضہ تھا اور ذوق طلب
تھا جو پورا ہو گیا۔ اسی طرح بقیہ علوم و بقیہ کتب کی حالت کو قیاس کر لیجئے
اب نہ تو طبائع میں وہ جولانی رہی اور نہ وہ جفاکشی، محنت و عرق ریزی
کی صلاحیت دماغوں میں رہی، نہ وہ فرصت و طمانیت رہی اور سب سے
بڑی بات یہ کہ نہ اس کی حاجت رہی۔ مشکل پسندی سے فکر اکتانے لگی۔
جدید کتابیں لکھی گئیں۔ ادب و انشاء کا طرز و اسلوب بدل گیا۔ قدما کی کتابیں
پریس میں آنے لگیں۔ اہل عصر نے ہمت کر کے ذوقِ عصری کی تشنگی کے لئے
جدید سانچوں میں ضیافت طبع کی خاطر عمدہ تصنیفات پیش کیں۔ اس
ماحول میں اگر ہم اب بھی ان غیر اہم وسائل پر جمے رہیں گے تو علوم اسلامیہ
سے توجہات ہٹ جائیں گی اور ہمارا یہ طرز عمل ہمارے اکابر و سلف
کی اس "تراث فاخر" اور اس علمی ثروت و سرمایہ کو فنا کے گھاٹ اتار
دے گا۔ یہ درحقیقت علم کی خیر خواہی نہیں بلکہ نادان دوست کا سا طرزِ
عمل ہو گا۔ کیا فقہ اسلامی میں کنز الدقائق، وقایہ، نقایہ، اور شرح
وقایہ کے بہترین بدل اسلاف ہی کی کتابوں میں موجود نہیں۔ کیا جامع
صغیر، جامع کبیر وغیرہ براہ راست مدون فقہ امام محمد بن حسن الشیبانی
کی کتابیں ہر حیثیت سے جامع نہیں ہیں؟ ان میں جو علم و برکت ہو گی وہ ان
متاخرین کی کتابوں میں کہاں سے ملے گی۔ میرے ناقص خیال میں کتب فقہ میں

نورالایضاح، قدوری اور ہدایہ کے علاوہ بقیہ سب قابل تبدیلی ہیں۔"

(ایضاً ص ۶۶، ۶۵)

انگریزی اور ہندی زبانوں کی تعلیم

"آزادی کے بعد" اور "آزادی سے پہلے" کے ہندوستان کا معاملہ یکساں نہیں ہے، آزادی سے پہلے اس ملک میں مسلمان "حکمران" اور "مقتدر" کی حیثیت سے رہ رہے تھے، اس وقت ان کی زبان، اس ملک کی زبان، حکومت کی زبان، علم وہنر کی زبان، اور تعلیم کی زبان تھی۔ مگر اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اب برادرانِ وطن کی تہذیب، ان کا کلچر، اور ان کی زبان ہی کو "مقتدیٰ" کی حیثیت حاصل ہے، اس ملک میں انہیں کی غیر معمولی اکثریت ہے، اور ہماری زبان کو یہاں کے "سیاسی حالات" نے "پرائی زبان" بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ آج سے چند صدی پہلے بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کی ساکھ قائم تھی۔ ان کی زبان علم وتحقیق کی زبان، ترقی یافتہ صنعت وٹکنالوجی کی زبان اور ارباب فکر ونظر کی زبان تھی۔ اس لئے اس کو اپنوں کے علاوہ بیگانے اور دوستوں کے علاوہ دشمن بھی سیکھا کرتے تھے، مگر اب معاملہ اس کے برعکس ہے آج کی دنیا میں بین الاقوامی سطح پر صنعتی اور علمی زبان انگریزی ہے۔ اور جغرافیائی اعتبار سے ہمارے لئے اس کے بعد بلکہ بعض حیثیت سے اس سے زیادہ اہم "ہندی زبان" ہے۔ علماء چونکہ ان زبانوں سے ناآشنا ہیں اس لئے ان کو ان زبانوں میں پھیلائی جانے والی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی کوئی خبر نہیں ہوتی، اور نئی نسل (جس نے اقتصادی اور صنعتی تقاضوں کے پیش نظر انھیں

زبانوں کو پڑھا ہے، یا دوسری تو میں جب اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتی ہیں تو اسی زبان کے لٹریچر پڑھتی ہیں جو اکثر مستشرقین اور اسلام دشمن مصنفین کی ہوتی ہیں، اور اسلام کی طرف سے ان کے دل میں نفرت کی تخم پڑ جاتی ہیں۔ اس طرح بہت سے دکھے ہوئے بے چین اور مضطرب "دل و دماغ" جو حق کی تلاش میں "قبول حق" کا جذبہ لے کر اسلام کی طرف بڑھتے ہیں، بدگمانی اور نفرت کے احساسات کے ساتھ واپس ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس میں بڑی حد تک ہماری غفلت کو دخل ہے "جدید چیلنج" کے مقابلہ کے لیے ناگزیر ہے کہ کم از کم ان دو زبانوں پر اسلامی درس گاہوں سے نکلنے والے طلباء ایسی نظر رکھتے ہوں کہ بے تکلف اسلام کے ناقدین کو پڑھ سکیں، اور جدید حلقہ میں داعیانہ کردار ادا کر سکیں۔ "فارسی" اسلام کی الہامی زبان نہیں ہے مگر ہمارے بزرگوں نے دعوتی نقطہ نظر سے اس پر ایسی مہارت حاصل کی کہ آج "فارسی" کو مسلمانوں سے علیحدہ کر کے سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اسلام نام "زبان" کا نہیں ہے، "پیغام" کا ہے۔ اس پیغام کو عام کرنے کے لئے ہمیں اپنے سلف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان زبانوں پر ایسی مہارت حاصل کرنی چاہیئے کہ ہمارے لئے وہ پرائی زبان محسوس نہ ہو۔ آخر زید بن ثابت رضؓ جو چھ زبانوں کے ماہر تھے، ہمارے ہی اسلاف میں سے تو ہیں؟

مختصر مدنی نصاب ۔ وقت کی ایک اہم ضرورت

ہمارے موجودہ باضابطہ دینی مدارس کی تعداد ظاہر ہے کہ عصری درس گاہوں کے مقابل بہت محدود اور تھوڑی ہے اور عصری درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والی نسل کے مقابلہ میں یہاں تعلیم حاصل کرنے والوں کا تناسب بہت معمولی ہے اسطرح

یہ بات ناگزیر ہو گئی ہے کہ ہم ایک ایسا مختصر مدتی نصاب ترتیب دیں کہ کم سے کم وقت میں فنون عالیہ کی بنیادی تعلیم ان کو براہ راست دین کے اصل ماخذ اور علماء اسلام کے گنجہائے گراں مایہ سے حاصل ہو۔

اس سلسلہ میں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ہوگی کہ اس نصاب میں صرف ان فنون کو جگہ دی جا سکتی ہے جو اسلامیات کے قیمتی عربی ذخیرے کو حل کرنے کیلئے کافی ہیں، جیسے نحو و صرف کے مبادیات اور عربی ادب، نیز وہ فنون جن کا تعلق براہ راست دین اور شریعت سے ہے جیسے فقہ، تفسیر، حدیث، اصول فقہ، اور اصول تفسیر — منطق، فلسفہ قدیم اور قدیم علم کلام، جن میں عام طور پر متکلمین کا خطاب اعتزال، ارجائیت اور لاادریت کی طرف ہے۔ ان کو اس نصاب میں جگہ دینا نامناسب ہوگا اور غیر ضروری، نیز ایسے کسی نصاب کی ترتیب کے وقت اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ ایسی کتابیں داخل نصاب کی جائیں جس میں فنی بحثوں سے زیادہ لفظی موشگافیوں اور دقت پسندی سے کام لیا گیا ہو۔ ہم اس سلسلہ میں مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کے بصیرت افروز اور اہم مقالہ کا ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کریں:

"میری ایک خواہش یہ ہے کہ ہمارے مرکزی مدارس میں جہاں علمی نصاب و علمی تحقیقات کے لئے کوشش ہو، اس کے ساتھ ایک ایسا مختصر نصاب ان حضرات کے لئے مقرر کیا جائے جو انگریزی تعلیم سے بقدر ضرورت فراغت پا چکے ہیں وہ مدرس عالم بننا نہیں چاہتے بلکہ صرف اپنی دینی ضرورت کے پیش نظر قرآن و حدیث و اسلامی علوم سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کیلئے

زیادہ سے زیادہ ایک سہ سالہ نصاب مقرر کیا جائے، جس میں صرف و نحو، قرآن و حدیث، فقہ و عقائد، اور ادب و تاریخ تک علوم شامل ہوں، انکو پڑھکر عربی زبان میں بولنے اور لکھنے کی قدرت کے ساتھ اپنی ضرورت پورا کر سکے اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ وقت کے اہم تقاضوں میں سے یہ ایک خاص تقاضہ ہے، اور بہت سے قلوب میں یہ تڑپ موجود ہے۔ جہاں اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ایک انگریزی گریجویٹ عالم دین بن سکے۔ اس کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دینی و دنیوی تعلیم میں جو خلیج حائل ہے اور فریقین ایک دوسرے سے مسلک خیال میں دو نقطوں پر الگ الگ ہیں ان میں اجتماع کی خوشگوار صورت پیدا ہوگی اور ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں گے اور خیالی و وہمی بدگمانیوں میں جو ہر فریق مبتلا ہے یہ اختلاف بھی ختم ہو جائے گا۔" (اقتباس)

راقم الحروف نے دارالعلوم سبیل السلام حیدر آباد میں اس کا عملی تجربہ بھی کیا ہے اور مذکورہ مدرسہ کے تحت ایسی مختصر مدتی درس گاہوں کی داغ بیل ڈالی گئی ہے جن کے بارے میں کھلے یا بلند کہی جا سکتی ہے کہ وہ ایک خوش گوار اور حوصلہ افزا تجربہ ہے بلکہ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس کی افادیت ہمارے مدارس کے متداول طویل مدتی نصاب سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ ایک گونہ زائد ہی ہے۔ کیونکہ اس میں شریک ہونے والے طلبہ اپنے ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ ان کے اندر ذاتی طلب اور جستجو ہوتی ہے شعور کی پختگی اور ذہنی بیداری ہوتی ہے۔ اس لئے نصاب کو قابلیت و صلاحیت سے بڑھ کر اس میں ادرک و کمال پیدا کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اس مختصر بدتی نصاب کی اہمیت وافادیت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ پر بھی روشن تھی اور انھوں نے "ضمان التکمیل فی غم مالنر تحمیل" کے نام سے ایک نصاب بھی مرتب فرمایا تھا شاید آپ کو سن کر تعجب ہو کہ نامور محقق عالم مولانا ظفر احمد تھانوی رحمہ اسی نصاب کے فارغ شدہ تھے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بھی کراچی میں اس نصاب کو جاری فرمایا تھا جو اب بھی خوبی کے ساتھ چل رہا ہے۔

طرز تدریس کی خامیاں

تعلیم کی افادیت میں بعض حیثیت سے نصاب تعلیم سے زیادہ "طرز تعلیم" اور مدرسین کی اپنی تعلیمی صلاحیتوں کو دخل ہے۔ نصاب تعلیم کے بذاتہ بہت مفید اور مناسب ہونے کے باوجود اگر پڑھانے والے نے صحیح طریق کار نہیں اپنایا تو طلبہ کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا۔ "جدید چیلنج" کے مقابلہ کے لئے جہاں نصاب تعلیم میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ وہیں اس سے بڑھ کر طرز تعلیم میں سدھار اور رہائق، نیز نئے مسائل سے واقف اساتذہ کی ٹیم تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

آج ہمارے مدارس کا حال یہ ہے کہ "کبریٰ" سے لے کر "ملا حسن" تک زبردست مغز سوزی کے باوجود منطقی فصول واجناس اور اشکال اور قضایا "کل انسان حیوان ناطق" اور اس قسم کی چند متعین مثالوں سے آگے بڑھ ہی نہ سکے۔ اساتذہ کی پوری تقریر انھیں چند انگلیوں پر گن لی جانے والی مثالوں کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ یہ حال ایک فن کا نہیں کم و بیش تمام فنون کا ہے حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسباق میں تقریر کم ہو، اور مشق وتمرین زیادہ ہو۔

اونچی جماعتوں میں رواج ہے کہ ابتداء میں بلا وجہ طویل تقریریں ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مصنف نے شروع میں خطبہ کیوں نہیں لکھا، اس کے اتنے جوابات ہیں اور مصنف نے فلاں بحث کے بجائے فلاں بحث سے کتاب کیوں شروع کی۔ اس پر یہ اور یہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور اس کے فلاں جواب ہیں، پھر جب "کتابیں" ذرا تیز رفتاری سے پڑھائی جانے لگیں تو حال یہ ہوتا ہے کہ طالب علم نے صرف عبارت پڑھ لی اور بس۔ اس کے بعد عبارت کا ترجمہ، عبارت حل کرنا، مطلب سمجھانا، سارا کام استاد کا ہے۔ نہ پڑھنے والوں کو کبھی کوئی اشکال ہوا۔ اور نہ استاذ نے اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت محسوس کی، اور اگر خوش قسمتی سے اساتذہ با صلاحیت ہیں اور مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں تو خود ہی تمام مالہٗ و ما علیہ کہہ سنایا۔ طالب علم کے لئے مطالعہ اور جستجو کا کوئی موقع ہی نہیں چھوڑا گیا۔ اس طرح علم کی وہ حقیقت کہ نظر و فکر اور معلومات کی مدد سے "مجہولات" کو حاصل کیا جائے ختم ہو کر رہ گئی۔ اس طرز تعلیم کی وجہ سے طلبہ کا دماغ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ پکی پکائی روٹی کھانے کے ایسے خوگر ہو جاتے ہیں کہ خود ذہن پر زور ڈالنا اور استاذ کی تقریر کے بغیر مطالعہ سے کتابیں حاصل کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اسی طرز تعلیم کو "گونگے درس" کا نام دیا ہے اور اس سے بھی افسوسناک حالت اس وقت ہوتی ہے جب شروع کی طویل تقریروں کے نتیجہ میں کتاب صرف چوتھائی حصہ ہو پاتی ہے کہ سال اپنا آخری سانس لینے کو تیار رہتا ہے، اب تو افہام و تفہیم کی نہ کوئی گنجائش رہتی ہے اور نہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے

اکثر و بیشتر خود اساتذہ ہی عبارتیں بھی پڑھ دیا کرتے ہیں اور اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قدیم طرز تعلیم کے مطابق زیادہ سے زیادہ خود طلبہ سے عبارتیں حل کرائی جائیں، ان کے اندر مطالعہ کا ذوق پیدا کیا جائے اور ہر سال اس سال کی کتابوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے دو ایک کتاب مطالعہ کے لئے رکھی جائیں اور اس کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہو جتنی دوسری درسی کتابوں کو، جب تک تعلیم کے ساتھ مطالعہ، کتب بینی اور حل عبارت کی ایسی صلاحیت اور ذوق پیدا نہیں ہو جاتا تعلیم کا معیار بلند نہیں ہو سکتا۔

پھر جس طرح اساتذہ قدیم فرق باطلہ اور ان کے نظریات کی تردید کرتے ہیں اور ان پر عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں تنقید کرتے ہیں یا جس طرح فقہی اصول و کلیات کی روشنی میں متقدمین کی کتابوں میں لکھے ہوئے فروعی مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس دور کے فرق باطلہ، جدید نظریات اور اس دور میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل پر روشنی ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ حالانکہ عصری تقاضوں کے پیش نظر ان کی اہمیت زیادہ ہے۔

طرز تدریس کی یہ خامیاں جواب "روایت" بن چکی ہے اور اساتذہ کی پوری کھیپ ہی اسی رنگ میں رنگ چکی ہے کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ اساتذہ کو اس کی باضابطہ تربیت دی جائے اور ہونہار طلبہ پر توجہ دیکر ان پر شروع ہی سے ایسی محنت کی جائے کہ اساتذہ اور معلمین کی اچھی کھیپ تیار ہو سکے۔

نظام تعلیم کی اصلاح کی ضرورت ہم اس عنوان کے تحت خود کچھ لکھنے کے بجائے مولانا محمد یوسف بنوری کی قیمتی اور فکر انگیز باتیں ان کے ایک مقالہ سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ امید کہ اہل مدارس ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"مدارس عربیہ کا نصاب تعلیم جس طرح محتاج اصلاح ہے اس سے کہیں زیادہ نظام تعلیم کی اصلاح کی حاجت ہے۔ نظام تعلیم سے میری مراد ایک وسیع مفہوم ہے جس میں طلباء کی تربیت و نگرانی، طلباء کا علمی معیار، تدریس و مطالعہ کا طریقہ، کن کن مضامین پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے طلباء کی ذہنی تربیت کے لئے کیا کیا ذرائع اختیار کئے جائیں۔ طلباء میں علمی استعداد پیدا کرنے کے لئے ترغیب و ترہیب کے کیا کیا وسائل ہونے چاہئیں۔ غرض صلاح و تقویٰ، علمی معیاری قابلیت، اخلاص و عمل کی روح کے پیدا کرنے کے لئے کن کن تدابیر کو کام میں لایا جائے۔ جب تک طلباء کے قلوب میں امراض نہیں تھے۔ دماغوں میں جد و جہد کا جذبہ موجود تھا طبیعتیں علمی مسابقت سے سرشار تھیں۔ اساتذہ میں اخلاص و تعلق مع اللہ کی روح جلوہ گر تھی اور تعلیم و تعلم دونوں کا مقصد خدمت علم و خدمت دین تھا یا کم از کم حصول علم صحیح، تو ان تدابیر کی حاجت نہیں تھی لیکن نقطہ خیال بدل گیا تعلیم کا مقصد حصول سند ہے یا حصول ملازمت۔ اساتذہ میں وہ روح نہ رہی۔ ان کا مقصد مشاہرہ کا حصول یا مہتمم کو خوش کرنا یا پھر

طلباء سے خراج تحسین کی سند حاصل کرنا۔ جب یہ امراض پیدا ہوں گے تو اب ضرورت ہے کہ انتہائی دل سوزی اور جانفشانی کے ساتھ اس کے علاج کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ سابق الذکر امور میں سے ہر ایک کافی تفصیل طلب ہے لیکن یہاں چند اہم ترین امور کی اصلاحی تدابیر کا اجمالی خاکہ پیش کرنا ہے:

(۱) مدرسین حضرات کا طریقۂ تدریس یہ ہونا چاہیئے کہ کتاب کے مشکلات کو سادے الفاظ میں اور اختصار کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کریں تعبیر کیلئے عمدہ دل نشین واضح طریقہ اختیار کریں۔ کتاب کے حل کرنے میں قطعاً تسامح سے کام نہ لیا جائے۔ حل کتاب کے بعد فن کی مبہات پر طلباء کو متوجہ کیا جائے جس مشکل کی تحقیق کسی نے عمدہ کی ہے ان کا حوالہ دیا جائے اور طلباء کو ان ماخذ سے روشناس کرایا جائے تاکہ مستعد ذہین طلباء اپنی معلومات کو آگے بڑھا سکیں فضول وبے کار مباحث میں طویل طویل تقریریں کر کے طلباء سے داد تحقیق حاصل کرنا، یہ تدریس کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس کو کسی نہ کسی طریقہ سے ختم کرنا چاہیئے

(۲) جو کتابیں ایسی ہیں جن کا ختم کرنا ضروری ہے پوری توجہ کرنی چاہیئے کہ کتاب ختم ہو جائے، کوئی بحث نہ رہ جائے جب تک کتاب ختم نہ ہو اس کا امتحان نہ لیا جائے۔ تا اختتام امتحان سالانہ مؤخر کیا جائے اور اس شکل پر قابو پانے کے لئے کتابوں کو تین حصوں پر تقسیم کرنا چاہیئے کہ سہ ماہی، ششماہی سالانہ امتحان تک کہاں سے کہاں تک پہونچ جانا چاہیئے۔ اس کا شدت سے انتظام کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ابتداء میں ماہ در ماہ بڑی بڑی تقریریں ہوں اور آخر میں ورق گردانی جس نے علم کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔

(۳) جو اساتذہ جن کتابوں کے لئے زیادہ موزوں ہوں، علمی استعداد اور طبعی رجحانات کے اعتبار سے تقسیم اسباق میں اس کا خیال ضرور رکھا جائے۔

(۴) ابتدائی دو سال کی تعلیم میں نتائج امتحانات میں نہایت سختی کی جائے۔ ناکامیاب کو قطعاً کسی مراعات کی بنا پر کامیاب نہ بنایا جائے۔

وسط اور انتہائی تعلیم میں معقول اعذار کی بنا پر تسامح قابل برداشت ہے لیکن ابتدائی تعلیم میں ہرگز ایسا نہ کیا جائے۔

(۵) ابتدائی تعلیم اچھے اور تجربہ کار اساتذہ کے حوالہ کرنی چاہیئے جو مسائل کو عمدہ اور مفید ترین طریقہ پر ذہن نشین کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ الغرض ابتدائی تعلیم کی عمدگی و پختگی پر بے انتہا توجہ کی ضرورت ہے اگر اعلی تعلیم کے اساتذہ کو ابتدائی درجہ کا کوئی سبق بھی دیا جائے تو اس میں بہت فوائد و مصالح ہیں۔

(۶) مدرسین کو اسباق اتنے دیئے جائیں کہ وہ مطالعہ و تدریس کی ذمہ داری پر صحیح طریقے سے عہدہ برآ ہوسکیں، جس کا اجمالاً اندازہ یہ لگایا جاسکتا ہے

ابتدائی درجہ کے اساتذہ کے پاس زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹے تعلیم کے لئے ہوں۔ متوسط درجات کے لئے چار گھنٹے آخری درجات کے لئے تین گھنٹے۔

(۷) اساتذہ ایسے رکھے جائیں جو ہمہ تن مدرسہ سے وابستہ ہوں ایسا نہ ہو کہ صرف دو تین گھنٹے کا رسمی تعلق ہو یا کہیں اور ملازم ہوں مدرسہ کے مصالح کے پیش نظر یہ صورت بہت اہم و قابل توجہ ہے۔

(۸) اساتذہ کے انتخاب میں حسب ذیل امور معیار انتخاب ہوں:

اخلاص وتقویٰ وصلاح و اعلیٰ قابلیت اور اس فن سے مناسبت جو اس کو حوالہ ہو۔ مدرسہ کے نظام سے وابستگی اور طلباء کے تعلیمی و اخلاقی معیار کو بلند کرنے کا جذبہ، تدریس کا شوق۔ یہ سب باتیں بہت اہم ہیں، ان میں سے کسی ایک بات کی بھی کمی ہو تو صحیح کام نہ ہو سکے گا۔

(۹) اساتذہ کو فن کی اعلیٰ کتابوں کی طرف مراجعت کرنی چاہیئے تاکہ عمدہ معلومات طلباء کے لئے فراہم کر سکیں۔ الغرض مطالعہ وجد وجہد ضروری ہے تن آسانی و راحت کوشی سے صرف سابقہ معلومات پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے۔ طلباء کے اندر اعلیٰ علمی معیار پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ اساتذہ اس کے معیار کے ہوں۔

(۱۰) جہاں تک مقدرت ہو طلباء کو راحت و آسائش پہونچائی جائے۔ اور طلباء اتنے رکھے جائیں جن کی عمدہ خدمت ہو سکے لیکن اس کے ساتھ ان کی علمی نگرانی، درس میں حاضری، رات کا مطالعہ، امتحان میں سختی۔ ان سب باتوں میں کوئی رعایت یا مسامحت نہ اختیار کی جائے۔ باقاعدہ طلباء کے احوال کا تفقد رکھا جائے اور اس کے لئے انتظام ہو۔ اگر کوئی طالب علم سہ ماہی میں ناکام ہو تو اس کا کھانا بند کر دیا جائے، اور اگر ششماہی میں بھی ناکام ہو تو آخر سال تک مزید موقع دیا جائے۔ اگر سالانہ امتحان میں بھی نتیجہ ساقط رہا تو اس کو علیحدہ کر دیا جائے۔ ان امور میں تسامح و مراعات کرنا علم کو دفن کرنے کے مترادف ہے۔

(۱۱) ابتدائی درجہ عربی کے طلباء کا ماہانہ امتحان لازمی قرار دیا جائے۔ مقدار خواندگی متعین کی جائے۔ کوشش ہو کہ اس حد تک کتاب پہونچ جایا کرے۔

(۱۲) ہر درجہ کے مناسب مطالعہ کے لئے کوئی نہ کوئی کتاب منتخب کر کے متعلم کو دی جائے۔ اس کتاب کا امتحان سالانہ لازمی قرار دیا جائے۔

(۱۳) طلباء کی اخلاقی نگرانی، عادات کی اصلاح، دینی وضع کی پابندی بے حد ضروری ہے۔ باجماعت نماز کی پابندی، سیرت و صورت کی تربیت و اصلاح کی طرف پوری توجہ ہونی چاہیئے۔ ان امور میں تسامح سم قاتل ہے غیر ذکی طالب علم اگر محنتی و صالح ہو تو اس کو برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن ذکی، بدشوق و بد اطوار ہرگز رعایت کے مستحق نہیں۔

(۱۴) مدرسہ کے ضوابط ایسے ہوں کہ طلباء خود بخود دینی وضع، صالحین کے شعار [illegible] پوشاک، خورد و نوش، معاشرت و عبادت میں پابند ہو جائیں

(۱۵) امتحانات میں مسابقت و تقدم کے لئے ترغیبی وظائف رکھے جائیں۔ سالانہ امتحان میں اعلیٰ کامیابی پر انعامات مقرر کئے جائیں۔ انعامات میں بجائے نقد رقوم کے عمدہ عمدہ کتابیں دی جائیں، اگر انعامی کتابیں ان کی علمی استطاعت و طبعی خصوصیات کی رعایت رکھی جائے تو اور سونے پر سہاگہ کا کام دے گی۔ مثلاً حدیث میں اعلیٰ کامیابی پر حدیث کی کوئی عمدہ کتاب، تفسیر میں اعلیٰ کامیابی پر تفسیر کی اعلیٰ کتاب دیجائے۔

(۱۶) ہر سال کے امتحانات میں ایک پرچہ امتحان کا ایسا ہو جس سے

عام اہلیت و قابلیت و علمی استعداد کا پتہ چلے۔ کسی خاص کتاب سے
تعلق نہ ہو۔ آخری فراغتِ علوم کے امتحان میں یہ تشخیص بہت ضروری سمجھی جائے۔

(۱۷) عربی ادبی زبان کی قابلیت، مقاصد تعلیم میں شامل کرنی چاہیے
ابتداء سے عربی انشاء نویسی کی مشق و تمرین کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔
ایک گھنٹہ مخصوص تحریر عربی کا ہو، جو ہر درجہ میں لازمی ہو تین سال تعلیم
حاصل کرنے کے بعد چوتھی جماعت میں تدریس کی زبان عربی ہو۔ مدرس عربی
میں پڑھائے، طلباء و اساتذہ کے سوالات و جوابات کا سلسلہ بھی عربی
میں ہونا چاہیے۔

(۱۸) طلباء میں عربی ادبی ذوق پیدا کرنے کے لئے عربی مجلات و صحف
و جرائد کا اجرا لازمی ہے اور ایک دار المطالعہ کا قیام اس مقصد کیلئے ضروری ہے

(۱۹) طلباء میں تقریر و خطابت کی روح پیدا کرنے کے لئے ہفتہ وار
جمعہ کی رات تقریر کرنے کے لئے مجلسیں قائم کی جائیں۔ ہر درجہ کے طلباء
کے لئے علیحدہ مجلس تربیت ہو، اور ہر ایک مجلس کی نگرانی و تربیت ایک استاد
کے سپرد ہو۔ آخری تقریر اس استاد کی ہو۔ ہر جلسہ کے لئے تقریر کا موضوع
متعین ہو، اور آخری استاد کی تقریر تقادیر پر تنقید و تبصرہ ہو۔ ہر ہفتہ وار
مجلس کا وقت کم از کم تین گھنٹے ہو۔

(۲۰) مدرسہ میں طلباء کی تکثیر جماعت و تکثیر افراد کی کوشش نہ کرنی
چاہیے۔ کمیت قابل التفات نہ ہو، کیفیت پر توجہ مرکوز رکھی جائے۔
مستعدین کی قلیل جماعت، غیر مستعد نااہل کے جم غفیر سے زیادہ قابل قدر

سمجھی جائے۔ ارباب مدارس کو تکثیر تعداد کے تنافس سے بے حد نقصان پہونچا ہے دس صحیح طالب علموں پر سالانہ بیس ہزار کا خرچ قابل برداشت ہونا چاہیئے لیکن سو نااہل طلباء پر بیس ہزار کا خرچ بھی قابل مواخذہ ہے۔ الغرض یہ خطرناک وبا کی شکل میں مدارس عربیہ دینیہ میں یہ مرض پیدا ہو گیا۔ اس کے علاج و تدارک کی طرف پوری توجہ کی ضرورت ہے۔

نظام تعلیم میں عوام کو مدرسہ کی امداد پر مائل کرنے کے بجائے علم دین کی خیر خواہی مقدم ہونی چاہیئے۔

خالق کی رضا مخلوق کی رضا سے مقدم ہونی چاہیئے۔ مخلوق کی رضامندی کی کوشش سے اور حق تعالیٰ کی رضا جوئی سے غفلت کے نتائج دینی و دنیاوی خسران ہے"۔

(ماہنامہ الفرقان بابتہ ماہ فروری و مارچ ۱۹۷۵ء صفحہ ۷۰ تا ۷۳)

بنیادی دینی تعلیم کی اہمیت اسلام میں یہ مقصود و مطلوب نہیں ہے کہ مسلمان دین کا تفصیلی اور تحقیقی علم حاصل کرے، یہ فرض کفایہ ہے۔ یعنی ہر بستی اور آبادی میں ایسے تحقیقی علم رکھنے والے چند علماء و فضلا ہوں تو کافی ہے۔ البتہ یہ ضرور مقصود و مطلوب ہے کہ ہر مسلمان دین کی ضروری اور بنیادی تعلیمات و احکام سے باخبر ہو یہ فرض عین ہے۔ یعنی فرداً فرداً ہر شخص کو اتنا علم رکھنا ضروری ہے، ورنہ اللہ تعالےٰ کے یہاں سخت بازپرس ہو گی۔

اسلام میں بنیادی و ضروری دینی تعلیم پر جتنا زور دیا گیا ہے اس سے عام طور پر مسلمان واقف ہیں، یہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ اس سے

اسلامی معتقدات محفوظ رہیں، عبادات کا تصور مضبوط رہے اور اسلامی اعمال واخلاق کی بجاآوری میں قوت اور مستعدی رہے۔ اور غیر اسلامی نظریات اور رسوم ورواج سے دوری رہے۔ اس لئے ہر زمانہ میں مسلم معاشرے میں بنیادی دینی تعلیم کی اہمیت شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی رہی ہے۔

یہ زمانہ جو الحاد ودہریت اور اخلاقی آوارگی کا ہے۔ سرکاری سطح پر بھی مذہبی تعلیم کا کوئی نظم نہیں، بلکہ سرکاری نصابِ تعلیم سے تو اکثر حالت میں مذہب کے خلاف بغاوت کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ عام مسلمان اپنی اپنی بستیوں، محلوں اور مسجدوں میں مکاتب ومدارس صحیح نظم وضبط کے ساتھ قایم کریں، اور جہاں قایم ہیں ان کا ہر حیثیت سے تعاون کریں۔ اور ان مکاتب ومدارس کا کام اس انداز میں نہ ہو کہ گویا یہ زندگی کا کوئی ثانوی کام ہے بلکہ اس کام کو اس زندہ احساس کے ساتھ کرنا ہوگا کہ یہ ہماری زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ مفسرین نے قرآنی حکم "لا تقتلوا اولادکم" کے تحت لکھا ہے کہ اولاد کا جسمانی قتل تو قتل ہے ہی، اس کے ساتھ اولاد کو دین سے بے بہرہ اور ناآشنا رکھنا "روحانی قتل" ہے۔ اور سنگینی میں جسمانی قتل سے روحانی قتل بڑھا ہوا ہے۔ لڑکیوں کو دینی تعلیم کا بھی خصوصی نظم ہونا چاہیے، اور ان کے لئے مستقل دینی ادارے قائم ہونے چاہئیں جن سے غفلت ایک "اجتماعی جرم" ہے۔ جن بستیوں میں مسلمانوں کے گھر دو چار ہیں ان کی دینی تعلیم اور اسلامی تہذیب کی حفاظت کی طرف توجہ بھی وقت کا ایک اہم کام ہے۔ ایسے مسلمانوں کو بڑی مسلم آبادی میں منتقل بھی کیا جاسکتا ہے۔

(۵۵) "خلوص" نیت اور بارگاہِ الٰہی میں اخلاص کی قدر ہے —

اس سلسلہ میں ایک بات یہ بھی قابل توجہ ہے کہ جو تعلیمی ادارے مسلمانوں کی ادارت اور انتظام وانصرام میں ہیں، ان میں دینیات کا ایک کمپلسری سبجکٹ ہونا عصری تقاضے کی تکمیل میں ضروری ہے اسکے ذریعہ تدریجی طور پر عربی گرامر، عربی ادب کے علاوہ قرآن، حدیث اور فقہ اسلامی کی بقدر ضرورت تعلیم دی جاسکتی ہے۔

بنیادی دینی تعلیم کے سلسلہ میں جماعتی اور تنظیمی سطح پر جمعیۃ العلماء ہند، امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، جماعت اسلامی ہند اور دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی کوششیں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، اور نئے کام کرنیوالوں کو ان سے روشنی مل سکتی ہے۔

نظم ونسق

دینی مدارس و مکاتب میں عام طور پر نظم ونسق کی کمزوری محسوس کی جارہی ہے، جس کی وجہ سے اس کی افادیت اور اثر انگیزی بھی مجروح ہوتی جارہی ہے۔ اس کی سخت ضرورت ہے کہ نظم ونسق کے معیار کو بلند کیا جائے۔ کھانے پینے، جگہ، رجسٹرات اور دیگر تعلیمی وانتظامی امور میں نظم کو مثالی اور پرکشش بنایا جائے۔ نیز دینی مدارس و مکاتب کا کلیدی اور مرکزی نظم ایسے افراد کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے جو ظاہر و باطن میں شریعت کے پابند ہوں اپنی اولاد کو بھی دینی درسگاہوں میں تعلیم دینا اپنے لئے باعث اعزاز و افتخار سمجھتے ہوں۔ دیکھا یہ جارہا ہے کہ جو لوگ مزاج دین سے نا آشنا ہیں اور تعلیم کو بھی ایک "مادی دوکان" کا درجہ دے کر "تاجرانہ انداز" سے سوچتے ہیں۔ علم و تحقیق کی خو بو سے دور ہیں، اس کوچہ میں انھوں نے بھی قدم

(سلسلہ ص۴۷) یا پھر مختلف انداز سے استہزاء اور تحقیر کا پہلو اختیار کرنا۔ یہ مرض دینی مدارس میں گھس آیا ہے جبکہ ان مدارس کے کام کی نوعیت اصولی اعتبار سے ایک ہے، اسلئے اسوقت اسکی بڑی ضرورت ہے کہ دینی مدارس کے درمیان علمی مواسات اور علمی مواخات و علمی روابط ہوں، اور ملی علمی اور دینی عنوان پر

(بقیہ ملاحظہ ہو ص۴۶)

نہیں رکھا، ایسے لوگوں کے نظام میں دخیل ہونے سے دینی مکاتب و مدارس سلفِ صالحین کے طریقے اور اپنے مخصوص نہج اور اصول و ضابطے سے ہٹ کر انتشار و خلفشار کے شکار اور ذہنی کشمکش کی آماجگاہ ہو جاتے ہیں۔ "ہر کارے و ہر مردے" (ہر کام کے لئے الگ الگ آدمی مخصوص ہوتے ہیں) کے اصول کو بہر حال پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

مدارس کا باہمی ربط

مدارس کے تعلیمی نظام کی درستی کے لئے ایک اہم ضرورت مدارس کا باہمی ارتباط اور مستحکم وفاق ہے۔ ایسا وفاق جو نصاب تعلیم کا تعین کرے، اور ہر جگہ یکساں نصاب نافذ کرے۔ قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کرنے میں اعانت کرے۔ امتحانات کا مشترک نظام ہو، اساتذہ کے لئے حالات کی رعایت کرتے ہوئے تنخواہوں کا معیار مقرر کرے۔ اسلامیات کے اہم موضوع پر لکچر اور تقریریں ہوں، طلبا کو تعلیمی اور اساتذہ کو تدریسی تربیت دینے کے کیمپ قائم ہوں۔ پھر ہر مدرسہ کے لئے تعلیم کا معیار مقرر کیا جائے اور مرکزی مدارس کی مرکزیت باقی رہے، ایک مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ دوسرے کسی مدرسہ میں جائیں تو انکے لئے آپسی کوئی ضابطہ اخلاق ہو۔ اور اس طرح کی دوسری باتیں باہمی مشورے سے سوچی جا سکتی ہیں۔

مگر میرے خیال میں یہ وفاق اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ تمام مدارس و مکاتب کا تعاون عمل اور اعتماد حاصل کیا جائے، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب وفاق کا بورڈ الگ تھلگ خود مختار ہو، اور اس سے کسی ایک مدرسے کی ترقی شہرت اور بالادستی مقصود نہ ہو، بلکہ تمام مدارس و مکاتب کے ذریعہ مجموعی طور پر دین کی سربلندی مقصود ہو، اور وفاقی بورڈ کا الگ دفتر اور عملہ ہو جو شب و روز وفاق کے اغراض و مقاصد کو روبعمل لانے میں سرگرم ہو، اور چند خدا ترس علماء پر مشتمل ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی ہو جسکا فیصلہ کسی بھی معاملہ میں آخری ہو۔

دو روزہ دینی تعلیمی و دعوتی کانفرنس

اکابر کی نظر میں

دو روزہ دینی تعلیمی و دعوتی کانفرنس سے متعلق اکابر علماء کے جو مکاتیب بنام حضرت مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقل مدظلہ آئے ہیں، ان میں سے چند اقتباسات ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

مبارک اجتماع

"دل چاہتا تھا کہ اس مبارک اجتماع میں حاضر ہوں لیکن متعینہ اور معلنہ پروگراموں میں اس درجہ گھرا ہوا ہوں کہ اس سفر میں حاضری کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ان چند سطور کے ذریعہ آپ کی کانفرنس میں شرکت کر رہا ہوں۔ حق تعالیٰ آپ حضرات کے عزائم کو پورا فرمائے، اور دکن کی سرزمین کے لیے باعثِ رحمت و برکت بنائے۔"

(حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ، مہتمم دار العلوم دیوبند)

مبارک اقدام

"بنیادی اور اہم مقاصد کی تعیین اور تعبیر کے لیے آپ کا یہ اقدام بہت مبارک ہے، حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ اس تعلیمی و دعوتی کانفرنس کو کامیاب فرمائے اور اُمتِ مسلمہ کو اس سے پورا پورا فائدہ پہنچائے۔ میں نے آپ کی کانفرنس میں شرکت کا ارادہ کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سفر کو آسان فرمائے۔"

(حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی مدظلہ امیر شریعت بہار و اڑیسہ و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

وقت کی ایک اہم ضرورت

"جہاں تک مدارس عربیہ اور عصر حاضر کے تقاضوں کا تعلق ہے، یہ عنوان وقت کی ایک اہم ضرورت کے عین مطابق ہے، ضرورت ہے کہ قدامت کی صداقت اور گہرائی اور جدت کی بیداری اور روشنی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔"

(حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مدظلہ، صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت دہلی)